قندیل

قیوم نظر

ناشر

کتاب خانہ پنجاب لاہور

بار اوّل — جون ۴۵ء — قیمت عہ

واحد نمایندہ

اردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ

لاہور

"حلقۂ اربابِ ذوق" کی مخلصانہ تنقید کے نام

ایم۔ نذیر پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور سے چھپوا کر کتاب خانہ پنجاب لاہور سے شائع کی۔

فہرست

ابتدائیہ

اپنی نظموں کے متعلق مجھے کچھ زیادہ غلط فہمی نہیں لیکن یہ خیال
کہ ان میں سے شاید چند ایک بھی کچھ مدت تک زندہ نہ رہ سکیں گی
مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ نفسیات کے
گورکھ دھندوں میں الجھانے والے جو چاہیں کہیں لیکن اس ضمن میں مجھے اپنے
طور پر بعض داخلی اور خارجی باتیں کافی وزن دار معلوم ہوتی ہیں۔ اس قسم کی داخلی
باتیں کہ زندگی کے متعلق میرا تجربہ چنداں امید افزا نہیں یا یہ کہ میرے رگ و پے
میں یاسیت گھر کر چکی ہے، ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں مجھ سے زیادہ
میرے دوستوں کو کچھ کہنے سننے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس رنگ میں
وہ مجھ سے زیادہ مجھ کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ البتہ بعض خارجی وجوہات ایسی
ہیں جن کے ذکر سے ان نظموں کے پس منظر پر روشنی پڑ سکتی ہے۔
خارجی باتوں پر گفتگو کرنا میرے لئے اس وجہ سے بھی ضروری ہے

کہ میں اپنے گرد وپیش سے بہت متاثر ہوتا ہوں اور بنی آدم کی بیشتر بوالعجبیاں یا قدرت کے اکثر مظاہر مجھے اپنی دنیا میں گم کر کے مجھ پر داخلی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گو اس سلسلے کے ہر گوشہ کی عکاسی میرے بس کا روگ نہیں چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ان نظموں میں ملکی جھگڑے، سیاسی نظریے، سماجی الجھنیں اقتصادی مسائل اور دقت کے اور بیسیوں جھمیلوں کے تار و پود بکھرتے ہوئے بظاہر نظر نہ آئیں لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ میں دنیائے رنگ و بو میں کھو کر زندگی کی دوڑ میں ان باتوں سے بے خبر رہا ہوں۔ میرے نزدیک ان نظموں کی جان و ماحصل یہی چیزیں ہیں اور ان نظموں کی رگ رگ میں اگر ان چیزوں کا خون رواں دواں نہیں تو کم از کم موجود ضرور ہے۔

پچھلے دس سال میں جس تیزی بلکہ باد پائی سے شاعروں کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو جا لیا ہے۔ وہ اس محشر خیز جنگ کے زمانے میں بھی حیران کن ہے۔ پھر صرف یہی نہیں ہر شاعر نے اپنے خاص رنگ میں اپنی افتادِ طبع کے جوہر کچھ اس طرح دکھائے ہیں کہ سست گام رہروؤں کے لئے نکتہ چینی کے کتنے ہی سامان پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کیلئے میرے خیال میں ہماری کوششوں کے سراہے جانے کی اتنی ہی گنجائش ہے جس قدر رسم سے برہم ہونے کی۔ کیونکہ ہماری اس طوفانی رفتار کی ذمہ دار رسم سے کہیں زیادہ ہر آن بدلتی اور ہر قدم پر اپنی پریشانی میں اضافہ کرتی ہوئی ہماری عہد یوں کی پرانی دنیا ہے۔ یہی دنیا جس سے کم از کم میں ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ان نظموں کے خارجی اور داخلی عناصر میں اگر جدید اور قدیم کا امتزاج پایا جاتا ہے تو اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔

جدید شعری کارناموں میں نظم آزاد کو کافی کوسا جا چکا ہے۔ نظم آزاد اگرچہ چند صورتوں میں ہماری بعض ضرورتوں کے لئے لابدی ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کی بیشتر حیثیت ابھی ایک طویل تجربہ کی سی ہے۔

مشتملات سے قطع نظر پرانے لکھنے والے نت نئے تجربوں کی دنیا میں اپنے آپ کو اس لئے نمایاں نہ کر سکے کہ ان کے وقت کا تقاضا اس سے مختلف تھا۔ ان دنوں زمانے کو اس قدر جلد کروٹیں بدلنے کا شعور نہ آیا تھا اور عافیت پسند ہونے کے باعث ان لوگوں کو ایک ہی روش بلکہ اپنی پرانی ہی ڈگر پر چلنے میں سلامتی نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس آج کل کے شعراء کے لئے شعر میں تجربہ کوئی بڑی یا خوفناک بات نہیں چنانچہ اس پوری طرح سے گرفت میں نہ آنے والے دور میں اکثر شعرا کچھ تجربے کر رہے ہیں۔ ان میں ہر شاعر نظم آزاد نہیں کہتا۔ لیکن اپنے نظریے کے مطابق مختلف طریقوں سے اپنی بات کہنا اور نئے تجربوں کی داغ بیل ڈالتا چلا جاتا ہے۔ میری بیشتر نظمیں ضمنی طور پر چند ایسے ہی تجربوں کی حامل ہیں ان میں اکثر اوقات میں نے اپنے نہایت قریب کے پیشروؤں یا ہمعصروں کے تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے مگر بعض جگہ شاید بالغ نظر آنے والوں کیلئے مناسب منزل نما چھوڑ جانے کی ہلکی ہلکی کوششیں بھی کرنا چاہی ہیں۔

ان تمام باتوں کے ہونے ہوئے میں اپنی نظموں کو اس صف میں جسے عرف عام میں نئی شاعری کہتے ہیں شمار کرتے ہوئے کتراتا بلکہ ڈرتا ہوں نئی شاعری کیا ہے؟ یا نئی شاعری کے اجزا کیا ہیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بآسانی نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل نئی شاعری کی حمایت میں کچھ کہنے والوں نے اس سلسلے میں ایسی گرہیں ڈال دی ہیں جن کو کھولنے کیلئے ہمیں اب دل سے زیادہ دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ نئی شاعری کی تعریف نہ تو ان تحریکوں کو بے نقاب کرنے سے ہو سکتی ہے جن کے تحت مختلف شعرا نظمیں لکھ رہے ہیں

اور نہ ان تاثرات کی چھان پھٹک ہی سے اس کے اجزا ڈھونڈے جا سکتے ہیں جن کی آغوش میں آج تمام دنیا چلی جا رہی ہے۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ہر نیا شاعر آزاد یا معرا نظم نہیں لکھتا۔ ہر نیا شاعر مزدور اور سرمایہ دار کے جھگڑے بھی نہیں چکاتا۔ بلکہ ہر نیا شاعر سیاسیات، جنسیات، نفسیات وغیرہ میں بھی گم نظر نہیں آتا۔ درحقیقت ہر نئے شاعر نے اپنی ایک دنیا الگ ہی بسائی ہے جس میں اس کے اپنے ہی خیالات، اعتقادات، محسوسات اور پھر ان میں ہر ایک کے اظہار کے عجیب و غریب استعاروں اور تشبیہوں کے جال بچھے ہیں۔ وہ اپنی اس دنیا میں مگن اور دوسرے کی دنیا سے بے نیاز ہے مگر اس کے باوجود ان سب میں ایک ایسا دردِ مشترک ہے جسے بیان کرنے کی بجائے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس دردِ مشترک کی تفصیل میں ہماری تمام کائنات شامل ہے۔ اس تفصیل کو جاننا نئی شاعری کو سمجھنا بلکہ خود اپنے آپ سے شناسا ہونا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی منزل ہے جس کے لئے ابن آدم کو خود آگاہی کی ایسی حدیں عبور کرنا ہوں گی جس کے لئے شاید وہ ابھی تک پوری طرح سے تیار نہیں ہو سکا۔

حرفِ آخر کے طور پر مجھے میرا جی کے متعلق یہ کہنا ہے کہ اگر وہ مجھ میں دوسری زبانوں کے ذخیرۂ نظم سے صحیح طور پر آشنا[1] ہونے کا شعور بروقت پیدا نہ کرتے تو اس مجموعہ کی اکثر نظمیں اپنی موجودہ صورت سے مختلف ہوتیں۔

مصری شاہ لاہور

قیوم نظر

جون ۴۵ء

---

[1] میں بعض انگریزی نظموں سے متاثر بھی ہوا ہوں۔

نیا سال

خوشبوؤں کی مہک سی آئی
روئے گل پہ چمک سی آئی
بادِ خزاں کا نرم سا جھونکا
آیا
اور اک سال گیا

تاریکی میں نور سا چمکا
لرزاں موتی سا شبنم کا

آنکھ سی جھپکی، آیا اندھیرا

چھپایا

اور اک سال گیا

اُڑتی اُڑتی گرد سی دیکھی

لب پر آہ سرد سی دیکھی

عمرِ رواں نے اک جھٹکا سا

کھایا

اور اک سال گیا

دسمبر ۱۹۴۰ء

رنگ و صوت

پھر اودے کالے رنگوں میں   بھڑکانے والے رنگوں میں
اُٹھے ہیں اُفق کے گوشے سے   ڈھل کر انگور کے خوشے سے

وہ بادل جن کے سینے پر
گویا تصویر نظر آئی

بہتی شمشیر نظر آئی   بگلوں کی لکیر نظر آئی
پھر خرمنِ ہوش پہ برق گری   پھر گلشنِ گوش پہ برق گری

لہرائیں سیمیں آوازیں
یاد آئیں شیریں آوازیں

پھر باغ کے کونے کونے سے خوشبو کے نرم بچھونے سے
شادابئ دل سے ہوئے پیدا (اور کس مشکل سے ہوئے پیدا)
وہ پھول کہ جن کی رنگینی
شعلوں کا جگر کہلاتی ہے
کانٹوں کی نظر بن جاتی ہے نغموں کا اثر برساتی ہے
پھر راگ میں رنگ سمو ہی گیا میں اپنے آپ میں کھو ہی گیا
پھر چمکیں رنگیں آوازیں
یاد آئیں شیریں آوازیں

پھر رُوحِ چمن تحلیل ہوئی   پھر ہیئتِ گُل تبدیل ہوئی
کیوں رنگوں میں گر سم نہ ملے   آواز کا زیر و بم نہ ملے
کیوں کان سُنیں آنکھیں دیکھیں؟
اِنسان بھی یُوں مجبُور رہے کیا؟
یہ نغمہ رنگ و نُور ہے کیا؟   یہ قدرت کا دستور ہے کیا؟
کیوں چشم و گوش کی پابندی   کیوں عقل و ہوش کی پابندی
یوں اُٹھیں غمگیں آوازیں
یاد آئیں شیریں آوازیں

جنوری ۱۹۴۱ء

غزل

زندگی چال چل گئی شاید
موت پھر آکے ٹل گئی شاید

کھا رہا ہوں ابھی فریبِ وفا
آرزو پھر بہل گئی شاید

پھر نہ اُٹھی گری جو خرمن پر
برق بھی ساتھ جل گئی شاید

جوششِ عشق کیا کیا تو نے
بات اُن کی نکل گئی شاید

ہنس رہا ہوں فراقِ دائم پر
غم کی صورت بدل گئی شاید

اُن کے رُخ سے نظر نہیں ہٹتی
نوجوانی مچل گئی شاید

تیز اتنی نہ تھی شرابِ حُسن
دل کے سانچے میں ڈھل گئی شاید

پھر اُٹھا سیلِ اضطرابِ نظر
پھر طبیعت سنبھل گئی شاید

اگست ۳۵ء

ناچ

سازکی صداؤں پہ

چھن چھپنا، چھپنن چھپنن

ڈھل رہا ہے، بانکپن

ناچ! ناچ سحر فن

سازکی صداؤں پہ

ہاتھ، آنکھ، لب ہلیں

حسن کی حدیں ملیں

ذوقِ ناز سے گذر
جسم و جان ایک کر
سرخوشی کے طور ناچ
ناچ ! ناچ ! اور ناچ

پاؤں میں تھکن نہ ہو
انگلیوں میں دم رہے
فرقِ پیچ و خم رہے
کیفِ زیر و بم رہے
پاؤں میں تھکن نہ ہو
ڈگمگا نہ شمعِ نو

تھرتھرا رہی ہے لو
جل رہی ہے زندگی
بس یہی ہے زندگی
زندگی کا دور ناچ
ناچ! ناچ!! اور ناچ

مارچ سنہ ۴۱ء

غزل

نگاہوں سے دل میں سمانے لگے ہو

محبّت کا جادو جگانے لگے ہو

مٹانے لگے ہو ہر اک نقشِ ہستی

جوانی کو بے خود بنانے لگے ہو

تصوّر کے خاکوں میں بھرنے لگے رنگ

امیدوں کی بستی بسانے لگے ہو

رگِ جاں میں اُترنے تو نغموں کی لے میں

مری روح میں گنگنانے لگے ہو

مجھے لے چلے ہو کٹھن وادیوں میں

تماشائے منزل دکھانے لگے ہو

گماں بھی نہ ہو جب مجھے زندگی کا

مرے پاس اسوقت آنے لگے ہو

مجھے بھی لگے پیار سے دیکھنے تم

مجھے بھی نظر آزمانے لگے ہو

ستمبر ۳۸ء

عشقِ گریزاں

سرد ہو چکی محفل

اور تو نے پروانے

خواہشوں سے بیگانے

جان سے گذرنے کا

کھیل ہی نہیں کھیلا

بجھ گیا تیرا بھی دل؟

سرد ہو چکی محفل

آدمی کو جینا ہے

ہمکنارِ غم ہو کر
لطفِ زندگی کھو کر
آج اور کل، پرسوں
بے بسی کے بل برسوں
زہرِ زیست پینا ہے
آدمی کو جینا ہے

عمر بھر نبھا اس کی
یہ طویل مجبوری
اپنی اصل سے دوری

وجہِ دردِ ہستی ہے
ننگِ نام و ہستی ہے
عمر ہے سزا اُس کی
عمر پر نہ جا اُس کی

دیکھ رات جاتی ہے
اُٹھ ابھی ایک کر آ
بن سنور چمک کر آ
صبح ہونے سے پہلے
موت ہی سے دل بہلے
شمع جھلملاتی ہے
دیکھ رات جاتی ہے

مارچ ۱۹۴۱ء

برسات کی رات

کالی کالی بہت ہی کالی
بے ربط مگر جواں حسینہ
کیا رکھتی ہے زیست کا قرینہ

ملنے لگے اسکے سرمگیں لب
دانتوں کی لکیر ہے درخشاں
یا روح بہار ہے پرافشاں

آئی ہے صدا وہ قہقہے کی
کانپ اٹھی ہے کائنات ساری
ہے ذوقِ جنوں پہ وجد طاری

اب بندھ گیا تار آنسوؤں کا
روتی ہے عجیب سادگی سے
پُرہول مہیب دلکشی سے

نمناک ہوئے ہیں خار و خاشاک
دل چاک ہوا کلی کلی کا
بڑھنے لگا درد زندگی کا

مارچ ۱۹۴۱ء

غزل

کر گیا کام نشانہ تیرا
امتحاں میرا بہانہ تیرا

تیرا ہونا ہی تھا کافی، ما تا،
دام تیرا تھا نہ دانہ تیرا

کیوں ہو محدود محبت میری
کیا نہیں حسن یگانہ تیرا؟

میں ہی کیوں صرف بلا ہوں آخر
نام لیتا ہے زمانہ تیرا

جانے کیا شے تھی نہ سمجھا اب تک

زندگی یعنی فسانہ تیرا

نغمۂ رنگ ہے شورِ بلبل

بوئے گل گویا ترانہ تیرا

کیا یہی تیری حقیقت تھی نظرؔ

رہنِ غم کیفِ شبانہ تیرا

جون سنہ ۴۰ء

مجبوری

یہ چمکتی آنکھیں، یہ ترشے ہوئے لب شعلہ کار
یہ دہکتے گال، یہ شاداب پھولوں کی بہار
کیفیت بر دوش جوبن کا نکھار
ہو رہے ہیں تیری مبہم خامشی کے سائے میں اب شرمسار

اپنی پُرکاری سے تُو جس کو سراہے گی کبھی
تیری مجبوری اُسے چاہے تو چاہے گی کبھی
رہ سکے گا حُسن کا یونہی وقار
جانتا ہوں ورنہ کیوں یوں رو رہی ہے آج تو دیوانہ وار

تجھ کو جانا تھا مگر یہ آخری صورت بھی کیا
اور تو جذبات سے خالی حسیں مورت بھی کیا
کیا نہ تھی اب تجھ میں تابِ انتظار
تیرے اپنوں نے کیا کیوں تجھ کو تیری موت سے یوں ہمکنار

کیوں انہوں نے ناشناسائے جنوں سمجھا تجھے
اپنی ناکامی کے آگے سرنگوں سمجھا تجھے
تیرے احساسات کا اُن پہ مدار
شمع آئینِ کہن پہ آہ یہ جلنا ترا پروانہ وار

تیرے سینے میں بھی پل سکتی ہے دنیا چاہ کی
سختیاں تو بھی تو سہہ سکتی ہے سوزِ آہ کی

کیوں انہیں آیا نہ اس کا اعتبار
حسنِ رنگیں تر کی خواہش حسنِ رنگیں کو نہیں کیا زینہار

تیری فطرت اور یوں جبر و رضا کی بندشیں
تو نے کیوں چاہی ہیں خود بیجا حیا کی بندشیں
دشمنِ ہوش و خرد ہے یہ شعار
وقت باقی ہے ابھی کچھ اب بھی تو کہہ دے نہیں بس ایک بار

جولائی ۱۹۴۱ء

غزل

ماتھے پہ ٹیکا صندل کا اب دل کے کارن رہتا ہے

مندر میں مسجد بنتی ہے مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرّے میں سورج اور سورج میں ذرّہ روشن رہتا ہے

اب من میں ساجن رہتے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے مارے بیٹھے ہیں

روتے ہیں رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اِک آہ نشانی جینے کی رہتی تھی مگر جب وہ بھی نہیں

کیوں دُکھ کی مالا جپنے کو یہ نرکا سا تن رہتا ہے

اے مجھ پر ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو یہ تو کہو

یوں کتنک جان پہ بنتی ہے یوں کتنک جوبن رہتا ہے

دل توڑ کے جانے والے سن دو اور بھی رشتے باقی ہیں

اِک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اِک پریم کا بندھن رہتا ہے

[illegible]

اُس بازار میں ایک شام

(م کے نام)

چند چاندی کے سرد سِکّوں میں
گرمیٔ حسن بِک رہی ہے یہاں
اے غمِ عشق دیکھ بھول نہیں
نغمۂ نور کائنات سرور
کاسۂ زر میں ڈھالتی ہے شام
اور کیا اس میں دلکشی ہے نہ پوچھ

آسمان کی حسیں بلندی سے
اُڑ کے آیا کثیف خاک یہ کون

اے غمِ دوست دیکھ بھول نہیں
پھونک کر پر ترے تخیل نے
بیڑیاں بے حسی کی پہنی ہیں
اور کیا شئے قبول کی ہے نہ پوچھ

معصیت کی یہ زہد پاش بہار
بن رہی ہے نشاطِ دیدہ وگوش
اے غمِ زیست دیکھ بھول نہیں
تیری تہذیب کے سیاہ نقوش
انتہائے کمال کا حسیں مآل
اور کیا ذوقِ زندگی ہے نہ پوچھ

دسمبر ۱۹۴۳ء

خوابِ گراں

قمقمہ بجلی کا روشن تھا ۔۔ بجھا ہے کیونکر ۔۔

چاند بھی نکلا نہیں ۔۔ ابر ۔۔ ہوا کا طوفاں

سرد بستر ہے ۔۔ کھُلے روشنداں

شور ۔۔ دروازے پہ دستک سی ہوئی تھی ۔۔ باتیں

جیسے دربان کی آواز تھی کھوئی کھوئی

مجھ سے ملنے کا تھا خواہاں کوئی

ایک سایہ ـــــ کسی مانوس حسیں پیکر کا
جس کے دامن میں کئی ایسے ہی سائے لرزاں
رات کے سینے پہ جس طرح دھواں

وہم تھا میرا کہ دراصل وہی سایہ تھا ـــــ
یاد اب مجھکو نہیں ـــــ جیسے میں گھبرایا تھا
اُس نے کیسے مجھے جتلایا تھا

میرا اقرارِ محبّت ـــــ مری رنگیں قسمیں
جن کی رعنائی میں اُلجھی تھی جوانی اُس کی
اور پھر جال بچھی گئی تھی اُس کی

سہمے سہمے سے مرے قہقہے گونج اُٹھے تھے

محفلِ زیست میں بے معنی تھا اب اُس کا ورود

روحِ ناپاک، خبیث و مردود

میرے آرام کی دشمن، مرے سُکھ کی بیرن

جیسے میں اُس کو جھڑکتا ہی چلا جاتا تھا

سایہ معدوم ہوا جاتا تھا

اب نہ تھا کچھ بھی مگر ایک بھٹکتی آواز

شعلے بن بن کے اندھیرے میں بھڑک اُٹھتی تھی

گویا کوندے کی لپک اُٹھتی تھی

اور میں ظالم و بے حس تھا — سُنتا تھا یہ سنے
جیسے اس رات کی تاریکی فسانہ ہوگی
اور مری موت کا سامان ہوگی

تم بھی جاگ اٹھی ہو — روتی ہو — مری جان سنو!
کیا میں زندہ نہیں — تم تو نہ مجھے جھٹلاؤ
گرم بستر ہے — قریب آجاؤ

دسمبر ۱۹۴۱ء

غزل

آشکار اس قدر شباب نہ کر
میرا جینا مجھے عذاب نہ کر

مجھ کو چھپ چھپ کے بار بار نہ دیکھ
اس حقیقت کو بے نقاب نہ کر

میں کہاں اس نگاہ کے قابل
ذرّۂ دل کو آفتاب نہ کر

برق ڈھلتی ہے اِس تبسّم میں
بجلیوں سے مجھے خطاب نہ کر

اہلِ دل اور بھی ہیں محفل میں

مجھ کو پابندِ انتخاب نہ کر

لمحہ بھر لا کے مجھ کو اپنے قریب

عمر بھر خانماں خراب نہ کر

اٹھ رہی ہیں وہ انگلیاں مجھ پر

اس طرح مجھ کو کامیاب نہ کر

مجھ کو حاصل سکونِ مرگ کہاں

یوں مجھے صرفِ اضطراب نہ کر

چھوڑ دے میرے حال پہ مجھ کو

مجھ میں پیدا یہ انقلاب نہ کر

دسمبر ۲۹ء

حسنِ آوارہ

اُڑ رہی ہے تیتری
یا ہوائے دلبری

نازک و نحیف سی
نوبر و لطیف سی

گھر نہ بار ہے کوئی
اور نہ اپنی شے کوئی

بس جدھر نکل گئی نکل گئی

اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

سر خوشی کو چھوڑ کر
زندگی کے موڑ پر

باغ و راغ کاٹتی — آبِ جُو کو چاٹتی
بوئے گل سے جھومتی — خار و خس کو چومتی
جی رہی ہے جس طرح بھی جی سکی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

ایک بے دماغ نے — کہنہ سال زاغ نے
زودِ حرص و آز میں — شورِ برگ و ساز میں
اُس کو جب مسل دیا — دلکشی کا پھل دیا
آہ بھی نہ یہ نصیب کر سکی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

اب وہ کس لئے مرے
شہد جمع کیوں کرے
سونگھتی ہے پھول کو
زرنگار پھول کو
پھر اُسے لتاڑ کر
بال و پر کو جھاڑ کر
ڈھونڈتی ہے مسکراکے اور ہی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

اپریل ۴۴ء

غزل

فریبِ حسن کی گھاتیں حسیں ہیں
محبت میں بھی کیا باتیں حسیں ہیں

جما یا رنگ ایسا آنسوؤں نے
سمجھتا ہوں کہ برساتیں حسیں ہیں

ستارے ٹوٹتے ہیں صورتِ دل
بظاہر چاندنی راتیں حسیں ہیں

میسّر جو کسی پہلو نہ آئیں
وہی اُن کی ملاقاتیں حسیں ہیں

نہ کیوں دبتی فغاں سرگوشیوں میں
دعاؤں سے مناجاتیں حسیں ہیں

نظر حسن سے شکستِ زیست دیکھی
جوانی کی وہی ماتیں حسیں ہیں

مئی ۴۰ء

داشتہ

رات، دھندلی تیرگی، نمناک گھاس
ٹھہری ٹھہری مضمحل پھولوں کی باس
تنہا اُداس:

باغ کی دل سرد خاموشی سے دور
اَن گنت تاروں کا بے ترتیب نورؔ
سامانِ طُور

اُڑ رہی ہے جیسے موجِ نیم تاب
کہکشاں ــــ یہ بارہا دیکھا سراب
منزل کا خواب

بھول کر اپنی تمنّا کا مآل
گوشۂ دل میں وہی زہرہ جمال
لایا خیال

جس نے وا کی مجھ پہ چشمِ التفات
مجھ کو سمجھا اپنی ساری کائنات
ہر تلخ رات

آج اُس کی دلکشی گھٹتی لکیر
اُس کی بڑھتی تیرگی کا ہم صفیر
میرا ضمیر

دیکھتا ہوں پھر نجومِ خوش خرام
جانے کب تک لے گا مجھ سے انتقام
یہ حسنِ بام

اکتوبر ۴۴ء

غزل

مل جائیں گے تم کو چاہ والے
ڈھونڈو گے مگر نباہ والے

کب مٹتا ہے شوقِ دید دیکھیں
کب دیکھتے ہیں نگاہ والے

یہ کیسی فراق کی گھڑی ہے
خاموش ہیں آہ آہ والے

مجبور دعا کرو نہ مجھ کو

ہاتھ اُٹھتے نہیں گناہ والے

آیا دمِ واپسیں بھی آخر

آ تو بھی "خدا گواہ" والے

روشن ہیں اسی سے بتکدے بھی

گم جس میں ہیں لا اِلٰہ والے

کیا شے تھی نظمِ غزل یہ تیری

چپ ہو گئے واہ واہ والے

اگست سنہ ۴۰ء

ترغیب

مسلسل ہوا نے

سمیٹے ہیں پتوں کے بکھرے خزانے

سفیدے کی شاخوں سے تاروں کا جھرمٹ

محبت کے فتنوں کا جادو جگانے

چلا آ رہا ہے

اندھیرے ہیں روشن

زمستاں کی راتوں کا یخ بستہ جوبنا

بھڑکنے لگا ہے سلگتا تصوّر
تمنّا کی ایذا پرستی کا دامن
بڑھا جا رہا ہے

الجھنے سے حاصل
ہوئی ہے نہ آسان ہو گی یہ مشکل
بلاخیز موجوں کے رستے میں تنہا
کھڑا ہے سمندر کا صدچاک ساحل
کوئی گا رہا ہے

اپریل ۲۲ء

غزل

زیرِ زمیں جو مجھ کو ہوس آسماں کی ہے
شاید یہ مشتِ خاک تیرے آستاں کی ہے

کرتا ہوں جمع بے سروسامانیاں کہیں
بجلی کو پھر تلاش میرے آشیاں کی ہے

تو بھی اگر نہیں نہ سہی چشمِ التفات !
مجھ پر نگاہِ لطفِ غمِ جاوداں کی ہے

اِک رازِ ناکشودہ ہوں اک حرفِ ناتمام

تکمیلِ راز مجھ پہ مرے رازداں کی ہے

گُم کر چکا ہوں پائے جہت آشنا کو بھی

لیکن نہ کھل سکا کہ تمنّا کہاں کی ہے

کیا موت نے بھی سیکھ لئے دلبری کے ڈھنگ

یہ طرزِ بے رخی تو اس آرامِ جاں کی ہے

قائم دوائے عشق نظر جس کے دم سے تھا

یہ تُربتِ شکستہ اُسی نوجواں کی ہے

فروری ۳۶ء

محرومی

اور یہ بھرپور بہار
ان گنت کلیوں پہ دوشیزہ نکھار
ہر جواں شاخ باندازِ کمال اٹھتی ہوئی

پھول ہنگامہ بدوش
نازک اندام ہواؤں کا خروش
پھیلتی پھیلتی خوشبوئے وصال اٹھتی ہوئی

تمتماتا ہوا ایاغ

شوقِ بے پایاں کو منزل کا سراغ

مشتعل آرزو ہم رنگِ جمال اُٹھتی ہوئی

ہر برس تیرا خیال

بُن ہی لیتا ہے کسی طور یہ جال

ورنہ تو کس کے لئے بادِ شمال اُٹھتی ہوئی

جون ۷۴ء

واپسی

گہری نیند سے جاگا سبزہ
پھولی سرسوں، ہوا لہرائی
موسمِ گل نے لی انگڑائی

شاخ شاخ پہ کھلے شگوفے
کچی کوری کلیاں آئیں
اٹکیں، چٹکیں، دودھ نہائیں

چہک رہا ہے پتّہ پتّہ

سُنتا ہوں اَن سُنے فسانے

دھیان کی دنیا مانے نہ مانے

جانے اب کیوں ٹھان چکی تو

بھُولی بات کو دہرانے کی

میرے سپنے میں لوٹ آنے کی

کون اِس جھونکے کو سمجھائے

صحنِ چمن سے جو اُٹھا ہے

سُوکھے پیڑ کو چھیڑ رہا ہے

جولائی ۱۹۴۴ء

غزل

دلِ خوگرِ غم اور لبِ فریاد ہے خاموش
اے والئے ستم اب ستم ایجاد ہے خاموش

کس منہ سے ہو محرومیِ قسمت کی شکایت
اک آہ تھی وہ بھی دمِ فریاد ہے خاموش

پامالِ محبت ہوں نہ سمجھے گا زمانہ
یوں صورتِ شبنم میری افتاد ہے خاموش

کیا نالۂ غم بھی ہے ترے مرغ گرفتا۔
کیوں شکوۂ بیداد پہ صیاد ہے خاموش

رہتی تھی نظر جس کی رُخِ لالہ و گل پر
گوشے میں قفس کے وہ چمن زاد ہے خاموش

کرتا تھا نظر سوزِ جگر سے جو چراغاں
عرصہ ہوا وہ بندۂ بیداد ہے خاموش

دسمبر ۲۵ء

خلشِ تاثر

خاموش ہوا بھیڑوں کا گلہ چلتے چلتے ممیا کر

جا پہنچا شاید باڑے میں بُو سی رستے میں پھیلا کر

چُپ چاپ کھڑا ہے دُور ادھر وہ جنگل کالی چیلوں کا

سرسبز پہاڑوں کو پُرہول بنانے والی چیلوں کا

آواز نہیں آتی اب جھیل کی جانب سے مرغابی کی

سنسان فضا بیجان ہوا میں ہے لرزاں روح خموشی کی

یوں لائی دوش پہ لاش سی کیا رنگیں دن کی بربادی کی

یہ شام یہ گہری شام یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

قدرت کے سکوتِ مجسم کی اس ہیبت آرائش ہے
وادی کے ذرّے ذرّے کی ہم آہنگی کی نمائش ہے
ہر نقش شجر ہر فیل نما پتھر دنیا ہے طلسموں کی
حد ہی نہیں آتی کوئی نظر اس طرفہ فسوں کی قسموں کی

ہر شے پر خواب سا طاری ہے اور میں ہوں صرف بیخوابی
لینے ہی نہیں دیتی دم مجھ کو میری فطرتِ سیمابی
اے کاش کبھی کم کر سکتی میرے بھی دل کی بے تابی
یہ شام یہ گہری شام یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

میں مصنوعات کا پروردہ بلکہ انسان بھی مصنوعی
میرا ساماں بھی مصنوعی میرا ایمان بھی مصنوعی

بسنے والا میدانوں کے ہنگامہ پرور شہروں کا

بے ربط، سکوں سے ناواقف اور شوریدہ سر شہروں کا

میں قدرت کے اسرار و رموزِ نہاں سے آگاہ کہاں

اس اندھیارے کے اتھاہ سمندر کی میرے دل میں چاہ کہاں

اور مجھ کو دکھاتی ہے تو حقیقت کے جلووں کی راہ کہاں

یہ شام یہ گہری شام یہ لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

یہ منظر خوش آئند تو ہیں ان سے مگر کیوں ڈرتا ہوں

کیوں انکی دل آویزی کو وحشت ناک تصور کرتا ہوں

کیوں مجھ کو بستر سنگ و شجر کا ماحول سکونِ قلب نہیں

کیوں میری دنیا اس دنیا سے جا کے بسی ہے دور کہیں

کیوں میں نے ڈالا ہے اپنے ہی جی کو آپ ہلاکت میں

کیوں ہو ہی نہیں جاتا میں خود پیوستہ جہانِ قدرت میں

کیوں لے ہی نہیں لیتی مجھ کو اپنی آغوش کی وسعت میں

یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

ستمبر ۱۹۴۰ء

انجام

دیو داروں کے نُزش رُو پتّے
جھڑ کے پیوندِ خاک ہو بھی چکے
جھیل کی لُٹ چکی ہے شادابی
کب سے میداں میں پہنچی مرغابی
ہر طرف نرم برف جمنے لگی
سر برآوردہ ندی تھمنے لگی
چیختی ہے ہوا گزرتی ہوئی
کوہساروں کے پار اُترتی ہوئی

میں ہوں اور اک بسیطِ تنہائی
خشک و تر پر محیط تنہائی
راہ بھولا ہوا ہوں منزل کی
کیا کہوں کیا ہے کیفیت دل کی

اشک آنکھوں سے بہتے جاتے ہیں   کتنے افسانے کہتے جاتے ہیں

سانس رکتا ہے لڑکھڑاتا ہوں

ذرّے ذرّے سے خوف کھاتا ہوں

ایک شفّاف ٹکڑا بادل کا   یا کوئی پرزہ نوری آنچل کا

دُور اُفق کے قریب لہرایا   آرزوؤں نے دام پھیلایا

میں نے چاہا کہ اپنی بات کہوں   ہو سکے گر تو اُس کے ساتھ چلوں

میری رفتار برق وار نہ تھی

اور اُسے تابِ انتظار نہ تھی

برف کے اک وسیع میداں پر   اب پڑا دیکھتا ہوں خوابِ سفر

راستہ ہے نہ رہنما کوئی میرے پہلو سے گم ہے سایہ بھی

شام کی زردی آئی جاتی ہے مُردنی بن کے چھائی جاتی ہے

دم بخود ہے ہوا گزرتی ہوئی

کوہساروں کے پار اُترتی ہوئی

جولائی سنہ ۱۹۳۱

تھکن

رات کی نیلی سیاہی لے چکی ہے اپنے دامن میں سنہری شام کو
حسن کی تاریکیٔ تنہائی کی دنیا پر ہے رنگِ بے دلی چھایا ہوا
نیم جاں قدروں کی مبہم گردشوں پر نغمۂ خاموش لہرایا ہوا

تھم گئی ہے شعلہ پرور دن کے محشر خیز ہنگاموں کی جیتی تند رو
رفتہ رفتہ بجھتے بجھتے اپنی منزل کے سکوتِ مضمحل کی چھاؤں میں
آج جنبش ہی نہیں ہے کیفِ تنہائی کی زنجیروں سے بوجھل پاؤں میں

فلک کی آتشوں میں غرق ہے تارِ نفس موہوم احساسات کا

شمع و تارے نظر آتے ہیں جیسے دل گرفتہ پھول کملائے ہوئے

جن کی تابانی کے نغمے خارزاروں کے شگوفوں سے ہوں بل کھائے ہوئے

ہر طرف اک آبنوالے خوابِ نامعلوم کا پھیلا ہے بحرِ بے کراں

جس کی سطحِ پُرسکوں پر لوٹتی ہے زندگی کی خستہ ساماں چاندنی

نیند یعنی موت کے سانچے میں آخر ڈھلنے والی غم بداماں چاندنی

مارچ سنہ ۴۱ء

غزل

دیوانگیٔ دل کی توقیر نہیں جاتی
اب خاکِ محبّت بھی اکسیر نہیں ہوتی

اے برقِ فنا تو ہی تقدیر مری بن جا
غارت گرِ ساماں سے تدبیر نہیں ہوتی

کیوں دیکھتے ہیں مجھ کو حیرت سے جہاں والے
کیا غم کی یہاں کوئی تصویر نہیں ہوتی

میں لائقِ کشتن ہوں یہ سچ ہے مگر دیکھو

تقدیر بگڑ جانا تقصیر نہیں ہوتی

آدابِ وفا سیکھو، اندازِ جفا چھوڑو

یوں قصرِ محبت کی تعمیر نہیں ہوتی

کیوں درد نہیں بڑھتا کیوں موت نہیں آتی

کیوں خوابِ پریشاں کی تعبیر نہیں ہوتی

تاثیرِ محبت سے آہیں تو ہوئیں پیدا

آہوں میں نظر پیدا تاثیر نہیں ہوتی

دسمبر ۳۵ء

بے بسی

ایک بے کیف شام کے بس میں
رینگتے سائے، اونگھتی راہیں
چند سہمے ہوئے چھپے اوریں
زندگی رنگ و بو سے بیگانہ
سرنگوں، دل گرفتہ اور اُداس
آہ وہ اُسکے قہقہے اور یں
چاہتا ہوں گزر سکوں اک بار
آرزوؤں کے چیستانوں سے

ہوں جہاں لاکھوں چھپے ادریں

ہر نفس میں ہو نغمۂ ناہید
خاکِ پا ہو میری بہار بدوش

یہ سماں جاوداں رہے ادریں

دلِ ناکام کی تن آسانی
خندہ زن ہے مرے ارادوں پر

ورنہ دریائے غم بہے ادریں؟

جانے یونہی رہیں گے اب کب تک
رینگتے سائے، اونگھتی راہیں

چند سہمے ہوئے چھپے ادریں

ستمبر ۴۳ء

خزاں

تصورات کی دنیا بھی میرے بس کی نہیں
چمکتے خوابوں کی رعنائیاں تمام ہوئیں
تمام انجمن آرائیاں تمام ہوئیں
جہاں میں میں ہی نہیں ہوں جہاں میں کچھ بھی نہیں

رہینِ شام ہی دیکھے نگاہ والوں نے
وہ دن کہ جن میں محبت کے جانفزا نغمے
مہکتے پھولوں کی آغوش میں مچلتے تھے

جنہیں گداز کیا تھا شگفتہ حالوں نے

میرے خیالوں سے روشن تھی کائناتِ بہار

انہی کے دم سے میرا عہدِ شوق رنگیں تھا

جمالِ گلشنِ فردا میں رنگِ تزئیں تھا

نہ ٹلنے والے غمِ زیست پر ہوئے جو نثار

زمیں کے سینۂ پامال سے ہیں پیوستہ

بکھرتے خاک اڑاتے بھٹکتے جاتے ہوئے

درِ سکوں کو تغیر سے کھٹکھٹاتے ہوئے

وہ پتے سائے میں جنکے چمن تھا گلدستہ

جولائی سنہ ۴۱

مآل

اپنی امیدوں کے ویرانوں سے
سر جھکائے ہوئے تنہا چپ چاپ
میں کسی طور گذر آیا تھا
پھر مرے اُجڑے سکوں سے بھرپور
ہر طرف پھیلی ہوئی دنیا میں
نغمۂ گل نہ گلِ نغمہ تھا

میری نخ بستہ حرارت سے مگر

قندیل

چند کھوئی ہوئی نظروں کا جہاں
آج یوں اُلجھا کہ جی جانتا ہے
جیسے کچھ پا ہی لیا ہو اُس نے
میری منزل کے خرابے کا نشاں
دردِ دل خاک جہاں چھپاتا ہے

جانے کیوں اب یہ گماں ہوتا ہے
اپنی سنگین خموشی کو لئے
اِک نئے سانچے میں ڈھلنا ہے مجھے
اور اُسی درد کی ایک قندیل
جس کو تاریکی میں رکھا اب تک
اپنے ہی سائے پہ جلنا ہے مجھے

نومبر ۱۹۴۴ء

غزل

بسکہ نہ کام آ سکا عشق میں دل دیا ہوا
حاصلِ زیست ہو گیا نام ترا لیا ہوا

حدِّ جنوں سے ہوں پرے ورنہ کہاں کہ رہ سکے
خندۂ نوبہار سے چاکِ جگر سیا ہوا

عشق کی آبرو وفا حسن کی آرزو جفا
میرا کیا تو کیا ہوا آپ نے جو کیا ہوا

کیوں نہ ہو اے بے خودی کیا ہو مجھے وجہِ سرخوشی

دے کے سکونِ زندگی ہے یہ جنوں لیا ہوا

تیرے کرم سے گو اٹھا لطفِ جہانِ مدّعا

کم نہ مگر ہوا ترا ذوقِ ستم دیا ہوا

چارہ گرِ حیات نے موت سی شے بھی دی تو کیا

شوقِ طلب میں بارہا زہر یہ تھا پیا ہوا

نومبر ۳۹ء

زندگی

مآلِ حسن کی ناکامیوں میں کھوئی ہوئی
خزاں سے گرد خزاں باغ سے گزرتی ہے

ضعیف پتّے سرکتے ہیں، جمع ہوتے ہیں
بکھرتے ہیں پھر قافلوں کی صورت میں
عجیب خشک سے چلتی ہے بادِ نادرہ کار

یہ تیرگی کو اُجالا سمجھتا چمگادڑ

فضا کے سینے کو بوجھل پروں سے سہلاتا
نہ جانے کونسی بستی کو اُڑتا جاتا ہے

اُداس چاند کے دامن میں روشنی بھی نہیں
فسردگی ہی جھلکتی ہے چشمِ انجم سے
بہار آئی تھی کس شام کے تبسم سے

جنوری ۱۹۴۵ء

غزل

مٹ مٹ کے محبت میں تیری یوں تجھ کو پکارے جاتے ہیں

کٹ کٹ کر دریا کی تہ میں جس طرح کنارے جاتے ہیں

کیا خوب ہے تیری محفل بھی محفل ہے کہ چکر دنیا کا

کچھ نیست کے منہ ماتے آتے ہیں کچھ در دکے مارے جاتے ہیں

کیوں عشق کو مٹنا حسن کو بننا لازم تھا معلوم ہوا

کچھ کام بگاڑے جاتے ہیں کچھ کام سنوارے جاتے ہیں

رہ مل تو گئی ہے منزل کی لیکن یہ ہوئی حالت اپنی

ارمان بڑھائے جاتے ہیں اور حوصلہ ہارے جاتے ہیں

یاد دورِ محبت تھا وہ بھی آنکھوں میں ہیں نقشے پل پل کے

یا وقت یہ آیا ہے کہ یونہی اب عمر گذارے جاتے ہیں

امیدوں کی بستی اجڑی دل مٹ گیا لیکن پھر بھی ہاں

اشکوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آہوں سے گذارے جاتے ہیں

شام آئی بھی آنا تھا انہیں کیا رات پہاڑ سی کٹ بھی گئی

تنگ آکے فریبِ عشرت سے یا چاند تنا رے جاتے ہیں

نومبر ۴۰ء

نورجہاں کا مزار

ہر طرف چھتریاں کھجوروں کی
جن کے سائے میں کچھ دردِ نہاں
سردِ خاموش خستہ حال غمگین
بوڑھی بیلوں کے بوجھ سے خمدار
ان کو گھیرے ہیں سرو گرد آلود
ننگِ ہستی ہوا ہے جن کا وجود

جن کے سینوں میں راز کی صورت

کانوں تک پہنچی نیم باز آنکھیں
احمریں گال، کھلتی پیشانی
کھنچتے ہونٹوں کی آتشیں قوسیں
جن کی خاطر بنے تھے راج محل
خوشنما شہر، قلعے، تاج محل

سرد بے باک نسلِ تیموری
سر بر آوردہ، وضعدار، بلند
خوگرِ گرم و سرد تہذیب، حلیم،
بے نیازِ مآل، حسن پسند
صرف سودائے انتقام نہیں
اپنے انجام کا غلام نہیں

فروری ۴۳ء

اپنی کہانی

اُس کی آنکھیں ہیں — دہکتے ہوئے انگاروں پر
مرمریں راکھ کا باریک سا شفاف غلاف
دم بخود شعلوں کی شدت سے چڑھا ہو جیسے

شیر کے پنجرے کو گھیرے ہیں تماشائی کئی
دوپہر، موسمِ سرما کی بھلی دھوپ مگر
وہ کسی اور ہی عالم میں پڑا ہو جیسے

اُس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے وہی رات ابھی
جس میں کمزور شکاری نے ریاکاری سے
ایسی دنیا میں وہ خود جس کا خدا ہو جیسے

جس میں ہنگامۂ محشر ہو کبھی اُس کا خرام
سانس لے سکتا نہ ہو جس میں کوئی اُس کے سوا
اُس کی آواز جہاں سیل بلا ہو جیسے

ایسی دنیا میں کیا سینکڑوں ہاتھوں سے اُسے
دست و پا باندھ کے یوں فاقہ کشی پہ مجبور
جامِ آزادی میں پیغامِ فنا ہو جیسے

تنگ و تاریک ہے اب روزنِ زنداں کی طرح

تلخئ صبر میں لپٹا ہوا پامال گچھا سا

جس میں وہ — کھُردرا سا اک ڈھیر پڑا ہو جیسے

اور پھر سامنے اُس کے ہیں پھدکتے آہو

چرچراتے ہوئے لنگور، اکڑتے بندر

بوڑھا لومڑ — جو کھڑا اُونگھ رہا ہو جیسے

اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے احساس کا خوں

سرد لوہے کی سلاخیں، یہ گراں دیواریں

توڑ ہی ڈالے گا اب ٹھان چکا ہو جیسے

دسمبر ۴۱ء

نئی تحریکیں

ہوا چلی — کنول کنول سے کھیلتی ہوا چلی

پھسلتے مینہ جہاں نما میں تھرتھری سی ہے
صدائے آب و رنگ جیسے اٹھ کے گہری نیند سے
دھلی ہوئی فضا کے مشکبو بدن میں رچ گئی
ہجوم موج نیلگوں یہاں وہاں کہاں نہیں!
ڈھلکتے موتیوں کا تھال ایک ایک پتہ ہے
نکھر رہا ہے دمبدم جو سطح آب سے لگا

جیسے سنورتی تیرتی بطوں کا اجلا بانکپن
چھپی ہوئی کشاکشِ نمو میں گم نہ کر سکا

ہوا بڑھی — ہوا کے بے درا خرام سے اُٹھا
اچکتی سرسراہٹوں کا نغمۂ طلسم زا
وہ ایک سربلند لہر دفعتاً اچھل پڑی
کنارِ ریگ سے پرے کی داستاں ہی اور ہے
ہرے بھرے چنے کے کھیت میں مچی ہے کھلبلی
لپٹ لپٹ کے جھومتی ہے ایک ایک شاخِ نو
مچلتی لہر اک عجیب کیفیت میں ڈوب کر
وہ جیسے ایڑیاں اٹھا کے پھول چومنے کو ہے
مگر کہاں — ہوا کے بل پہ نرم نیلگوں کنول

سرک کے سر اٹھا کے دور — اور دور ہو گیا

ہر ایک سمت بڑھتا راگ ختم گیا — یہ کیا ہوا

سجیلی طرح دار گردنوں کا دلنواز خم

ہوا کے بے پناہ سلسلے کو جیسے کھا گیا

چھلکتی جھیل زندگی کی کشمکش کو بھول کر

فنا کے گھاٹ اترتے سکوں سے پھر لپٹ گئی

مچلتی لہر کے جتنوں کا اب کہاں کوئی نشاں

بطیں بھی سو گئیں نہ جانے کس جہاں میں کھو گئیں

فضا کے دم بخود لبوں پہ کوئی داستاں نہیں

کنول کنول سے کھیلتی ہوا کی زندگی ہے گیا

فروری ۴۵ء

جنگ

اُداس بستی میں محروم نقشِ پا راہیں
فسردہ گھاس کے سینے سے دُور ہیں سائے
شکستہ گاؤں میں دہقاں نہ خستہ جاں گائے

سلگتی شام کی سرخی سیاہ فام ہوئی
گراں ہے خاطرِ گل پر لطیف موجۂ باد
ملول گوشۂ صحرا [illegible] ہے لبِ فریاد

رہینِ شائبۂ موہوم رس بھرا پیغام
جگر فگار ہے مہجور آہِ نرم و گداز
شبِ دراز، ستارے، نہ ماہِ محرمِ راز

جمیل خاک کے ذرّوں پہ ہوگی کے نشاں
برہنہ گرسنگی بارِ زندگی سے چُور
مُہیب صبر کے دامن میں ہے ابھی مستور

عدوئے دوست نما اور فریبِ نشانِ وطن
درِ رقیب پہ جلتے ہیں جسم و جانِ وطن

نومبر سنہ ۴۱ء

جوانی

تُو نے دیکھا ہے اُسے

جاتے ہوئے ارضِ حجاز

کتنا موزوں تھا جواں قدِ دراز

— دل میں کھبا جاتا ہے

تو نے چاہا ہے اُسے

مصر! ابوالہول جمال

کتنے مردانہ تھے اُس کے خد و خال

— درد بڑھا جاتا ہے

تو نے پایا ہے اُسے

شمعِ شبستانِ فرانس

کس قدر گرم تھا اُس کا ہر سانس

—— جسم جلا جاتا ہے

تو نے روندا ہے اُسے

جنگ! لٹا میرا سہاگ

مادرِ گیتی میرے واسطے جاگ

وقت اُڑا جاتا ہے

جنوری [illegible]

غزل

ایسا چھوڑ تصور میں مرنا امیداں میں نکل آ جینے کو

طوفان کے سینے پر کھینا ہے تجھ کو اپنے سفینے کو

گرتوں کا سنبھلنا خوب سہی لیکن یہ سنبھلنے کو گرنا

حیرت ہے کہ چھوڑا کیوں تو نے جینے کے ایسے قرینے کو

کیوں ماند پڑا انجام سے یوں پھیلی ہوئی دیکھ کے تاریکی

بن تیشے کی یہاں ضرب یہاں کر اور پتھر سے اک نگینے کو

پامال چمن میں تیرے اگر آئے تو بہارِ نو آئے

شبنم کی بجائے غنچوں کو تاروں کا لہو دے پینے کو

ہر چند پسند ہیں تجھ کو نظر پہ خاک یہ چاک گریباں کے

یوں منظرِ عام پہ لانے سے کیا بربادی دل کے خزینے کو



جنوری ۱۹۴۲ء

شبخون

کالی، اندھی رات، بھیانک
پھیلی پھیلی خاموشی کا
کالا جادو، اس میں اچانک
اک ہنگامہ — سیلِ بلا ہے
ذرّہ ذرّہ کانپ اٹھا ہے

دوڑ رہے ہیں وحشی گھوڑے
ہیبت ناک گھنی تاریکی

مار رہی ہے آتشیں کوڑے
راج محل پیوندِ زمیں ہیں
شعلے ہیں اور اُنکے مکیں ہیں

چمکی خونِ آشام سیاہی
چیخیں، آہیں، ہچکیاں، نالے
وحشت سے لپٹی ہے تباہی
راکھ کے ہر سو ڈھیر کھڑے ہیں
زندہ مرگھٹ جن میں گڑے ہیں

بڑھتے بڑھتے جنوں کے سہارے

مثلِ شہابِ ثاقب پل میں
آئے گئے برسا کے شرارے

نقشِ پا ہے نہ راہگذر ہے
ویرانی تا حدِّ نظر ہے

وحشی گھوڑے مگر ہیں فسانے
وقت نے جن سے تراش لئے ہیں
اُلٹے سیدھے لاکھ بہانے

خواہشِ سیم و زر بھی نہیں ہے
فاقہ کشی کا ڈر بھی نہیں ہے

اسکندر، چنگیز، ہلاکو
یکساں تھا ان سب کی نظر میں
چشمۂ حیواں، چشمۂ باکو
اب بھی وہی ہے فطرتِ آدم
بربادی میں ہے عظمتِ آدم

غزل

آئے ہو یوں تباہ کرنے کو
آفریں اِس نگاہ کرنے کو

جان دیتا ہوں اپنے مرنے پر
سانس لیتا ہوں آہ کرنے کو

میری ہستی ہے دہر میں گویا
زندگی کا گناہ کرنے کو

جل گیا مثلِ آتشِ خاموش

دل تڑپتا تھا چارہ کرنے کو

سادگی میں ہے بانکپن پنہاں

حسن کو بے پناہ کرنے کو

اُن کو چاہوں نظر وہ بات کہاں

چاہتا ہوں نباہ کرنے کو

اکتوبر ۳۵ء

بنی آدم

یہ بھیانک سیہ، گھنا جنگل
جس کی صورت سے خوف طاری ہے،
کون جانے کھڑا ہے یوں کب سے
وقت پر اس کی عمر بھاری ہے

موٹے موٹے تنے درختوں کے
جھرّیاں چھال پر درشت و مہیب
گرتی گرتی جھکی جھکی شاخیں
اُبھری اُبھری جڑیں عجیب عجیب

سمٹے سمٹے سے زرد زرد پتّے
ساتھ موسم کے آتے جاتے ہوئے
پھیلے پھیلے سے ہر طرف سائے
گھاس پر تیرگی بچھاتے ہوئے

رات دن، ماہ، سال، سال بہ سال
ان کی ہیبت میں ڈھلتے جاتے ہیں
اور یہ پُر ہول نقش صدیوں کے
اپنی عظمت سے جلتے جاتے ہیں

فروری ۱۹۴۱ء

آندھی

دن کو لپیٹ میں لیکر اُٹھی اپنا رُوپ دکھانے
شام کی گہری دھندلاہٹ کی بوجھل خاک اُڑانے
دنیا پر چھا جانے

اپنی رَو میں بہا تی سب کو چلّائے پھنکارے
ساتھ نہ دے جو اُس کو مٹائے رہ رہ کوڑے مارے
بچھڑے اُسکے سرہانے

گھنے درختوں کی شاخوں کو موڑے توڑے جھکائے
ریت پہ بنے ہوئے محلوں کو جھٹکے دے دے گرائے
ڈھونڈے نئے ٹھکانے

بھاری بھرکم دروازوں کے پھاڑے رنگیں پردے
تہ خانوں میں روشن شمعوں کو ہنس کر گل کر دے
کہے انوکھے فسانے

رات ـــــ اندھیری رات، یونہی ہر لمحہ رنگ نکالے
سہما سمٹا اُجالا کیسے اِس طوفان کو ٹالے
صبح! کوئی کیا جانے

اکتوبر ۴۳ء

شام

مشتعل حسن کا انبوہِ کثیر
ہر طرف پھیلتا، بڑھتا، چڑھتا
روندتا آگ لگاتا، اٹھا
اب کہاں وقت دل و دوست کی غمخواری کا

خون آلودہ اُفق کی زنجیر
پیچ و خم کھاتا پُر اسرار دھواں

دُور اک ڈوبتی آوازِ گراں

ہر نشاں جانکنیٔ عشق کی دشواری کا

رات کی سرمگیں زلفوں کے اسیر

ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں، تارے

نوحہ خوانی کو ہیں نکلے، بارے

دن کی میت پہ بھرم کُھل گیا عیاری کا

دن بھی میرے جنوں کی تدبیر

اِک سکوں زار سے ٹکراتی ہے

تیرگی بڑھتی چلی جاتی ہے

مرمریں صبح بھی اک خواب ہے بیداری کا

جون ۱۹۴۲ء

صبحِ کاذب

تیرگی جیسے اُٹھی —

دست دپا یوں زیست کے آثار پھیلانے لگے
رات کی آنکھوں کے گوشے بھی نظر آنے لگے

راہ ناہموار، تنگ —

جا رہا ہوں پھر اُسی کہنہ سرائے ناز کو
چھیڑتا تھا میں کبھی جس کے سرود و ساز کو

بندھیں بھاری کواڑ —

کھولتا ہوں جانے کتنے بندھنوں کو توڑ کر
اسکے گھٹنے، اُس کے بازو، اُس کے سر کو پھوڑ کر

کھولتا ہے خونِ گرم —

دیکھتا ہوں اُس کو ایسے دوست کی آغوش میں
جس کی کوشش سے میں دب جاتا ہوں اپنے جوش میں

لوٹتا ہوں سرنگوں —

بڑبڑاتا، گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
وہ صحیح کاذب ہے کوئی یوں دل کو سمجھاتا ہوا

دہلی ۱۹۴۳ء

اُلجھن

یہ تیرگی
اور یہ ہر گھڑی بڑھتی ہوئی
اس کی انوکھی دلکشی
جیسے سکوں کے بحرِ بے پایاں کی حامل ہے یہی
دنیا کی منزل ہے یہی

جیسے یہی
پھیلی ہوئی نزدیک و دور
اِک جنّتِ کیف و سرور
جیسے اسی کی گود میں آسودگی پھولے پھلے

تسکین پائیں دل جیسے

اور روشنی

یہ مرجعِ پیکِ خیال
صورت گرِ حسن و جمال
اپنی چمکتی وسعتوں کا لاکھ پھیلائے فسوں
ممکن کہاں اس میں سکوں

لیکن نہیں
دن — کارزارِ رنگ و بُو
آئینہ دارِ آرزو
ہے گھاس پر بکھری ہوئی شبنم اسی سے ضو فشاں
جیسے زمیں پر کہکشاں

یہ دن بھی
ہنگامہ آرائے بہار
بے آب چہروں کا نکھار
اُڑتا ہے لیکر اس طرح انساں کی سعیٔ خام کو
گویا خدا ہے نام کو

یہ کشمکش
یہ روشنی کی زندگی
یہ تیرگی کی دلکشی
کیا اک پریشاں خواب ہی بن جائیں گے یہ دن یہ رات
جانے کہاں ہے کائنات

جولائی ۴۴ء

غزل

اُن پہ آئی کہاں ٹلی ہے ابھی
ذکر میرا گلی گلی ہے ابھی

ہر طرف شورِ نو بہار سہی
دم بخود پھر بھی ہر کلی ہے ابھی

جان دینا جنوں سہی لیکن
رسمِ دنیا میں یہ بھلی ہے ابھی

میری صورت پہ بھولنے والے
اُنکے وعدوں میں یہ ڈھلی ہے ابھی

غنچۂ دل کبھی کھلے شاید
زندگی کی ہوا چلی ہے ابھی

اک امیدِ سحر ہے رات کے پاس
اُس کے خوں میں یہی پلی ہے ابھی

اور کیا ہونگے زیست کے آثار
مجھ سے پیوستہ بے کلی ہے ابھی

جانے کیونکر ہوا نظر خاموش
بزمِ عالم میں کھلبلی ہے ابھی

اگست سنہ ۴۷ء

ساقی نامہ

پلا ساقیا بادۂ ارغواں	زمیں بن گئی رشکِ باغِ جناں
فلک پر ہے سرگرمِ مشقِ خرام	پسِ پردۂ ابر ماہِ تمام
مگر خواہشِ دیدِ حسنِ زمیں	اُسے رکھ نہیں سکتی حجلہ نشیں،
ردائے سیہ پھاڑ کر بار بار	وہ کرتا ہے نظارۂ روزگار
نگاہوں میں اسکی ہے مینائے نور	زمیں پر بہاتا ہے دریائے نور
فسوں کار ہے کس قدر چاندنی	ستاروں کی ہے ہمسفر چاندنی
خموشی میں گم ہے اُدھر شہر و دہ	ہوا ہے ادھر سیمبر مقبرہ
وہ مغلوں کی عظمت کا ادنیٰ نشاں	وہ بانئے ہیں جس کے ہے نورِ جہاں

جہانگیر کی آخری خوابگاہ — جہاں عشق نے آ کے چاہی پناہ

چمکتا ہے یوں گنبدِ مرمریں — کہ تھا طور کا جیسے منظر یہیں

در و بام و دیوار ضو ریز ہیں — غم و صبر میں عشرت آمیز ہیں

وہ ہے دلکشی صورتِ آب میں — مہ و ابر اُترے ہیں تالاب میں

ضیا پاشیوں کا جہاں ساتھ ہے — عروسِ فلک کہکشاں ساتھ ہے

نہیں رعب جلوے سے تابِ بیاں — کھڑا سر کے بل مقبرہ ہے یہاں

کھجوروں کے سائے میں سبزے کا رنگ — درخشاں کناروں سے کرتا ہے جنگ

شبِ تار میں ہے وہ تابندگی — چمک اُٹھے جس سے رہِ زندگی

ہوا ہلکی ہلکی سی چلتی ہوئی — گلوں کے تبسم میں ڈھلتی ہوئی

مگر جس سے جھکنا نہیں خود پسند — سرِ آسماں بوس ہے سرو بلند

چٹکتی ہیں کلیاں اس انداز سے — کہ پیدا ہوں نغمے ہر آواز سے

یہ موسم ہوا اور زندگانی کا ہوش — یہ محفل ہوا اور ہو غنچے خموش

"قرارِ دلِ بے قرار آگئی

بہار آگئی پھر بہار آگئی

دعائیں ہوئیں میکشوں کی قبول

عروسِ مئے مشکبار آگئی

گلِ نرم پر برگِ نوخیز پر

جوانی سرِ شاخسار آگئی

بھری ہیں فضاؤں میں موسیقیاں

مغنیِ فطرت بہار آگئی

گہرہائے شبنم بکھرتے نہ یوں

چمن کی مگر گلعذار آگئی

کیا ہے زمانے کو پابندِ عیش

بہانے سے وہ سحر کار آگئی

نظر آ رہی ہیں جو رنگینیاں
گلستاں کی پروردگار آ گئی"

مغنی ستم تو نے ڈھایا یہ کیا — قصیدہ سا مجھ کو سنایا یہ کیا

پریشان کر دی طبیعت مری — نہ سمجھا مجھے تو بھی قسمت مری

قسم ہے تجھے نغمہ بارِ ازل — نہ آئی نظر کیا تجھ کو کوئی غزل

غزل وہ محبت کی پرواز گاہ — وہ پامالِ غم دل کی رنگین آہ

بھرا جس میں ہو کیفِ ہجر و وصال — تمنا کا خوں بے کسی کا خیال

ہوئی ہو بیاں عشق کی واردات — بگڑتی ہو جس میں بن بن کے بات

جوانی کا وہ قصۂ دردناک — گریباں کیے جس پہ ہنستے ہوں چاک

جہاں بانکپن سے بڑھے سادگی — جہاں لطف دیتی ہو افتادگی

جہاں خامشی حسنِ تقریر ہو — جہاں غم مسرت کی تصویر ہو

نظر جس میں آئیں وفاداریاں — ستم دوستوں کی اداکاریاں

غضب ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کیا
کسی اور دنیا میں رہتا ہوں کیا

بیاں میرا کتنا ہے بے ربط سا
محبت کا ہے کیوں مجھے خبط سا

پلا ساقیا ہاں پلا ساقیا
مرے درد کی لا دوا ساقیا

حقیقت سے نا آشنا ہوں ابھی
تمناؤں سے کھیلتا ہوں ابھی

ابھی دیکھتا ہوں رُخِ آسماں
ابھی زندگی کا مجھے ہے گماں

ابھی دوڑتا ہے رگوں میں لہو
ابھی جی میں ہے موت کی آرزو

ابھی آتشِ عشق دمساز ہے
ابھی نغمۂ سوزِ غم ساز ہے

ابھی کر رہا ہوں وفاؤں پہ ناز
ابھی دردِ جانکاہ ہے دل گداز

ابھی دشت پیما ہے جوشِ جنوں
ابھی کیف زا اضطرابِ سکوں

ابھی حشر ساماں ہے یادِ شباب
ابھی ذرۂ دل میں ہے آفتاب

ابھی چاہتا ہوں محبت کو میں
حسینوں کو نغموں کو وحشت کو میں

تکلف کا پردہ اُٹھا مطربا
نہ اب ذوقِ بیدار کو اور آزما

معطّر فضاؤں پہ چھائے غزل پھڑکتی ہوئی کوئی آئے غزل

اُٹھا ناغمِ جاں ستاں اور ہے

زمانہ ابھی مہرباں اور ہے

جلا دیگی برقِ جہاں سوز کو

مری آہِ آتش فشاں اور ہے

عبث ہے دوائے جگر چارہ گر

تقاضائے حسنِ نہاں اور ہے

نہ ہوتی ہے مشکل کشا موت ہی

محبت میں جی کا زیاں اور ہے

تڑپتا نہ تھا یوں اسیرِ وفا

قفس میں کوئی امتحاں اور ہے

لبِ جوئے ساقیٔ مہوش کیسا تھا

بہارِ مئے ارغواں اور ہے

سنے ہونگے قصّے بہت عشق کے

نظر کی مگر داستاں اور ہے"

مغنی یہ دیپک تھا کیا تیرا راگ　　بدن میں لگادی مرے جس نے آگ

مرا شعلۂ عشق بھڑکا دیا　　مری روح کو اور تڑپا دیا

مجھے یاد آئے جوانی کے دن　　جوانی کے دن زندگانی کے دن

وہ دن جب نہ تھا دل جفا آشنا　　محبت کی دنیا سے ناآشنا

فریبِ وفا اس نے کھائے نہ تھے　　جفاؤں کے صدمے اٹھائے نہ تھے

نہ روتے تھے اس طرح مجھکو نصیب　　نہ آیا غمِ جانستاں تھا قریب

نہ آنکھوں سے بہتا تھا سیلابِ خوں　　نہ دیکھا تھا سامانِ جوشِ جنوں

تمنائیں رہتی تھیں ہر دم جواں　　نہ ملتا تھا اس بے حسی کا نشاں

اٹھایا نہ تھا رنجِ دیوانگی　　کہ دیکھا نہ تھا رنگِ بیگانگی

نہ مجبوریاں تھیں نہ رسوائیاں — نہ شبہائے فرقت کی تنہائیاں

بسر بسکہ ہوتی تھی آرام سے

غرض تھی مے و ساقی و جام سے — (اگست ۳۶ء)

سبو بھر کے ساقی پلانا مجھے — گرا چاہتا ہوں اٹھانا مجھے

نہ رے سامنے درد و غم آئے کیوں — مجھے یاد ماضی کی تڑپائے کیوں

نہیں ہے میسّر جوانی تو کیا — نہیں ہے جنوں کی نشانی تو کیا

جوانی کا دلکش ترانہ سہی — جوانی کا رنگیں زمانہ سہی

جوانی کا ہرچند خوش کن ہے نام — مگر ہے بھیانک جوانی کی شام

جوانی کا گو مختصر سا ہے دور — نرالے ہیں لیکن جوانی کے طور

جوانی کے رہتے ہیں تا زیست داغ — جوانی سے بھرتا ہے غم کا ایاغ

جوانی کی باتیں جوانی کا جوش — نہیں چھوڑتے زندگانی کا ہوش

جوانی میں انسان انساں نہیں — جوانی کا ایمان ایماں نہیں

جوانی کی بربادیوں کا ثبوت — مری زندگی کا مسلسل سکوت

مگر یہ ستم اور کیا ہو گیا — جواں سال ساقی خفا ہو گیا

غضب ہو گیا دیکھتے دیکھتے — بنا بُت خدا دیکھتے دیکھتے

نگاہوں کی شادابیاں لُٹ گئیں — زمانے کی آبادیاں لٹ گئیں

نہیں خندۂ گل کا کچھ اعتبار — زمینِ خزاں ہو گئی ہے بہار

کرشمہ ہے ساقی یہ کس ذات کا — بنا جو بتنگڑ مری بات کا

نہ کیوں تلخ ہوتی کہانی مری — نظر میں تھی اپنی جوانی مری

ستایا ہوا ہوں جوانی کا میں — اسی گردشِ آسمانی کا میں

جوانی کی گو ہے شکایت مجھے — جوانی سے لیکن ہے الفت مجھے

میسّر جو ہوتی جوانی مجھے — رلاتی نہ یوں زندگانی مجھے

بگڑتا نہ ساقی مناتے نہ ہم — عبث نازِ بے جا اٹھاتے نہ ہم

عبث ہے مگر ان کی نسبت بھی — نہیں آجکل ساقیوں کی کمی

گیا وہ پرانا زمانہ گیا — سنا ہے جہاں نے فسانہ نیا

زمانے پہ چھائی ہے تہذیبِ نو — عجب رنگ لائی ہے تہذیبِ نو

نہیں اب کسی پر کسی کا مدار — اگر ایک روٹھے تو ساقی ہزار

محبت کے خواہاں ہیں سیمیں بدن — سکھاتے ہیں خود عشق بازی کے فن

حسینوں کو راس آگئی دلبری — ہے نازیں غرق عشوہ گری

بہت بڑھ گیا گرچہ معیارِ حسن — زمانہ ہوا ہے پرستارِ حسن

گئے دن کہ نغمہ سرائی تھا عیب — سرِ انجمن خود نمائی تھا عیب

نہ تھے بے حجاب اس طرح نازنیں — کہ سینہ نمودار گم آستیں

جہاں میں جو یوں انقلاب آگیا — پھر اکیوں نہ واپس شباب آگیا

مغنی بلا تو کہ گاؤں گا میں — منا کر جوانی کو لاؤں گا میں

بہت گردشِ آسمانی سہی

بہت حسن کی بدگمانی سہی

محبت میں رہنما ہے کس کا نشاں

مری موت تیری نشانی سہی

مئے زندگی میں سمِ غم بھی ہے

مئے زندگی ارغوانی سہی

ترا درد ہے میری کل کائنات

مرا عشق تیری کہانی سہی

مرے شوق کا حوصلہ الاماں

تمنّاؤں کی بے زبانی سہی

کیا کیا نظر زندگانی میں اور

خراب محبّت جوانی سہی

سنہ ۳۸ء